حکمتِ اقبال

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم (۲۰)

خودی اور تخلیق (۷)

خدا کی تخلیق کی خصوصیات

ضروری ہے کہ کائنات کی تخلیق بھی یہی خصوصیات رکھتی ہو، لہٰذا کائنات کے بارے میں ہمارے ذیل کے نتائج درست ہوں گے۔

۱۔ کائنات کی ایک ابتدا تھی اور بالآخر اس کی ایک انتہا ہو گی۔

۲۔ کائنات اپنی ابتدا سے اپنی انتہا کی طرف متواتر آگے بڑھ رہی ہے اور اپنی ابتدا اور انتہا کے درمیان بہت سے درمیانی مرحلوں سے گزر رہی ہے۔

۳۔ ابتدا سے لے کر انتہا تک کائنات کے ارتقاء کا باعث کائناتی خودی کا ایک واحد مقصد یا نصب العین ہے، جس کی وجہ سے اس کی تخلیق ابتدا سے لے کر انتہا تک ایک واحد غیر منقسم اور مسلسل فعل بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر حالت اس کی گزشتہ حالت کی ارتقائی تبدیلی سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔

۴۔ کائنات کی تخلیق کا مدّعا کائناتی خودی کے اس نصب العین کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ایک مکمل اور خوبصورت کائنات (یعنی حسن و کمال کی انتہا پر پہنچی ہوئی نوعِ انسانی) وجود میں آئے۔ گویا اس کا مدّعا منتہائے کمال کی تخلیق ہے۔

۵۔ کائنات کے ارتقاء کے ہر مرحلہ پر کائناتی خودی کی فعلیت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے سارے ماضی کا جو حاصل اس کے سامنے ہے اسے ایک خاص سمت میں بدل دیا جائے تاکہ وہ اس کے نصب العین اور اپنے کمال کے اور قریب آ جائے۔ کائنات کے ارتقاء کے کسی مرحلہ پر بھی کائناتی خودی کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کوئی نئی چیز پیدا کرے جو اس کی گزشتہ تخلیقی فعلیّت

کے نتیجہ کے ساتھ کوئی علاقہ نہ رکھتی ہو اور اسے کالعدم یا نظر انداز کر کے اپنی جگہ بناتی ہو۔

۶۔ اگر کائنات اپنے ارتقاء کے کسی مرحلہ پر وہ صُورت اختیار نہ کرے جو اس نے کی ہے تو وہ اپنے ارتقاء کے اگلے مرحلہ میں داخل نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کے ارتقاء کی ہر حالت اس کی گزشتہ حالت سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے ماضی کا ارتقاء اس کے مستقبل کے ارتقاء کی بنیاد بنتا ہے۔ اس کے باوجود اس کا مستقبل اس کے ماضی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ کائناتی خودی کی قوّتِ ارادی سے پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ کائناتی خودی کا مخفی اندرونی مقصد اس کی تخلیق کی آشکار خارجی صُورت میں ظہور پذیر ہو رہا ہے اور جُوں جُوں اس کی تخلیقی فعلیت آگے بڑھتی جا رہی ہے اس کا یہ مخفی اندرونی مقصد بھی زیادہ واضح اور زیادہ آشکار ہوتا جا رہا ہے۔ اور کسی نکتہ رس دیکھنے والے کے لیے یہ بتانا زیادہ آسان ہوتا جا رہا ہے کہ وہ مقصد درحقیقت کیا ہے اور آخر کار خارج میں کس طرح سے ظہور پذیر ہو گا۔

اقبال نے خالق اور مخلوق کی حیثیّت سے خدا اور انسان کے باہمی تعلّق کو سمجھانے کے لیے ایک انسانی مصوّر اور تصویر کی مثال دی ہے۔ تصویر مصوّر سے کہتی ہے کہ میرے وجود کا دار و مدار تیرے ہنر پر ہے لیکن یہ انصاف نہیں کہ تو میری نظروں سے اوجھل رہے۔

کہا تصویر نے تصویر گر سے
نمائش ہے مری تیرے ہنر سے
ولیکن کس قدر نامنصفی ہے
کہ تو پوشیدہ ہو میری نظر سے

مصوّر جواب دیتا ہے کہ تیرے لیے یہی اچھا ہے کہ تو خبر پر قناعت کرے۔ نظر (یعنی حسن کا ذاتی مشاہدہ اور احساس جسے محبّت یا عشق کہتے ہیں) درد و غم کا باعث ہوتی ہے۔ حقیقتِ انسان و کائنات کا سچّا علم خدا کے عشق کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں جب تک عشق پیدا نہ ہو، قلب روشن نہیں ہوتا اور جہاں بینی کی استعداد حاصل نہیں ہوتی۔ جب تک جگر خون نہ ہو جائے، چشمِ دل میں نظر پیدا نہیں ہوتی۔ گویا نظر کے لیے ضروری ہے محبوب کے عشق میں جلنا اور جل کر مر جانا شرر کو دیکھو کہ وہ محبّت کے سوز سے روشن ہوتا ہے اور اپنے نُور سے جہاں کو دیکھتا ہے لیکن اسی جہاں

بینی کی وجہ سے ایک لمحہ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

گراں ہے چشمِ بینا دیدہ ور پر
جہاں بینی سے کیا گزری شرر پر!
نظر درد و غم و سوز و تب و تاب
تو اے ناداں قناعت کر خبر پر

لیکن تصویر پھر بھی خبر پر قناعت نہیں کرتی اور مصوّر کو جواب دیتی ہے کہ خبر عقل و خرد کی بے چارگی کے سوا اور کچھ نہیں، نظر دل کے لیے حیاتِ جاوداں ہے۔ اس زمانہ کی تگ و دو نے ہر مشکل کو آسان کر دیا ہے، لہٰذا اس زمانہ میں یہ کہنا کہ میں تجھے دیکھ نہیں سکتی ایک ایسا عذر ہے جو وقت کے تقاضوں کے مطابق نہیں۔

خبر، عقل و خرد کی ناتوانی
نظر، دل کی حیاتِ جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز
سزاوارِ حدیثِ لن ترانی

پھر مصوّر یہ جواب دے کر اس گفتگو کو ختم کر دیتا ہے کہ میرے دیدار کی شرط یہ ہے کہ تو اپنی نظر سے پنہاں نہ ہو۔ چونکہ تو میرے کمالاتِ ہنر میں سے ہے، تیرا اپنے آپ کو دیکھ لینا ہی مجھے دیکھ لینا ہے، لہٰذا مجھ سے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

تو ہے میرے کمالاتِ ہنر سے
نہ ہو نومید اپنے نقش گر سے
مرے دیدار کی ہے اک یہی شرط
کہ تو پنہاں نہ ہو اپنی نظر سے

ظاہر ہے کہ اس نظم میں مصوّر خدا سے اور تصویر انسان سے استعارہ ہے۔ اقبال کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنے آپ کو پہچان لے تو وہ خدا کو پہچان لیتا ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو اقبال نے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

ایک حقیقت ہے اور یہ فیصلہ دنیا کے علمی حلقوں میں قبول کر لیا گیا ہے، تاہم اقبال سائنس کے اس فیصلہ کی بنا پر یا رائج الوقت تصوّرات کی کشش کی وجہ سے ارتقاء کا قائل نہیں۔ اقبال کا نظریۂ ارتقا نہ تو متحجّرات (FOSSILS) کی دریافت پر موقوف ہے اور نہ ہی کسی سائنسدان کے نظریۂ ارتقا کی غیر معلوم کڑیوں کی کامیاب جستجو پر مبنی ہے، بلکہ اس کا نظریۂ ارتقاء خودی کی فطرت اور اس کے اوصاف و خواص کے علم سے ماخوذ ہے۔ یہ حقیقت کہ سائنس بھی اس نظریہ کی تائید کر رہی ہے، اس کی صحت اور صداقت کا مزید ثبوت ہے۔ کیونکہ ضروری ہے کہ ہر سچّی فلسفیانہ حقیقت بشرطیکہ وہ فی الواقع سچی ہو زود یا بدیر سائنس سے بھی تائید مزید حاصل کرے۔

اگر بالفرض سائنس دان کل کو ایسے جدید حقائق سے آشنا ہو جائیں جن کی بنا پر وہ نظریۂ ارتقاء سے انکار کرنے پر مجبور ہوں تو پھر بھی اقبال کا یہ نتیجہ کہ ارتقاء ایک حقیقت ہے اور اس کا سبب خالق کائنات کی ربوبیت ہے، اپنی جگہ پر قائم رہے گا اور زُود یا بدیر سائنس دانوں کو یہ مان کر اس کی طرف لوٹنا پڑے گا کہ انہوں نے جدید حقائق کا مطلب غلط سمجھا تھا۔ پھر اقبال کے نظریۂ ارتقا میں یہ بات بھی داخل نہیں جیسا کہ ڈارون اور کئی حکمائے ارتقاء نے سمجھا ہے کہ آدمی بندر یا کسی اور نچلے درجہ کے غیر انسانی حیوان کی اولاد ہے، جو اب زندہ ہے یا پہلے زندہ رہ چکا ہے۔ اقبال کے نظریۂ ارتقاء کے اندر یہ بات مضمر ہے کہ انسان اپنے ارتقاء کی ہر منزل پر انسان ہی سے پیدا ہوا ہے۔ یعنی انسان کی ہر بلند تر حالت انسان ہی کی پست تر حالت سے پیدا ہوئی ہے اور کسی غیر انسانی حیوان سے پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی مثال انسانی جنین کی نشوونما ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے انسان ماں کے رحم میں نشوونما پا کر اپنی حالتوں میں سے گزرتا ہے، تاہم انسانی جنین کی ہر حالت انسان ہی کی حالت ہوتی ہے۔ ایک نوع کی حیثیت سے بھی اگرچہ انسان اپنی ترقی کی مختلف حالتوں میں سے گزرتا ہے، تاہم انسانی جنین کی ہر حالت کی طرح ان حالتوں میں سے بھی کسی حالت میں وہ سوائے انسان کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

ماہرین حیاتیات کا اعتراف

آج دنیا بھر میں چوٹی کے ماہرین حیات (جن میں ایک جولین ہکسلے (JULIAN HUXLEY) ہے، اگرچہ عملِ ارتقاء کی مادّی اور لادینی توجیہہ کرتے ہیں، تاہم وہ اپنے ماہرانہ مشاہدات کی بنا پر

اس نتیجہ سے گریز نہیں کر سکے کہ عمل ارتقاء کا حاصل انسان ہے اور آئندہ کا ارتقاء بھی انسان ہی کے ذریعہ سے ہوگا۔ نظریات اور اقدار کی محبت انسان کا ایسا امتیاز ہے جو کسی حیوان میں موجود نہیں، لہٰذا آئندہ کا ارتقاء نظریاتی ہوگا اور اس بات پر موقوف ہوگا کہ انسان اپنی محبت سے نظریات و اقدار کو کس حد تک مطمئن کرتا ہے۔ علمی ارتقاء کا سب سے اعلیٰ اور عمدہ نتیجہ ترقی یافتہ انسانی شخصیت ہے۔ انسانی ارتقاء نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ان گہرے معنوں میں بے مثال ہے کہ وہ ایک ہی راستہ ہے جو انسان کی ضروری خصوصیات کو پیدا کر سکتا تھا۔ حیاتیاتی نقطۂ نظر سے یہ ناممکن ہے کہ ارتقائے حیوانات کا کوئی اور راستہ آگے جا کر کسی ایسے حیوان کو پیدا کر سکے جو انسان سے بہتر اور بلند تر ہو۔

جولین ہکسلے (JULIAN HUXLEY) اپنی کتاب "انسان دنیائے جدید میں" (MAN IN THE MODERN WORLD) میں لکھتا ہے:۔

"عملِ تخلیق کا سب سے اعلیٰ اور عمدہ نتیجہ ترقی یافتہ انسانی شخصیت ہے"۔

"انسان کے وجود میں آنے کے بعد ارتقاء کی نوعیت یکایک بدل جاتی ہے۔ انسانی شعور کے ساتھ اقدار اور نظریات پہلی دفعہ زمین پر ظہور پذیر ہوئے، لہٰذا مزید ارتقاء کا معیار یہ ہے کہ یہ نظریاتی اقدار کس حد تک مطمئن ہوتی ہیں"۔

"بظاہر حیاتیاتی نقطۂ نظر سے یہ بات ناممکن ہے کہ ارتقائے حیوانات کا کوئی اور راستہ آگے جا کر ایک نئے اعلیٰ اور ارفع جسمِ حیوانی تک جا پہنچے"۔

"انسانی ارتقاء کا راستہ بھی ایسا ہی بے مثال تھا جیسا کہ اس کا نتیجہ۔ یہ ان معمولی معنوں میں بے مثال نہیں تھا کہ وہ دوسرے تمام حیوانات کے راستوں سے مختلف تھا بلکہ ان عمیق معنوں میں بے مثال تھا کہ وہ ایک ہی ایسا راستہ تھا جو انسان کی ضروری خصوصیات کو پیدا کر سکتا تھا"۔

اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ ارتقاء کا مقصد صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کو پیدا کر کے اس کی شخصیت کو نقطۂ کمال پر پہنچایا جائے۔ گویا ماہرینِ حیاتیات کے ان نتائج سے بھی حضرتِ انسان کے بارہ میں اقبال کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ

ضمیرِ کُن فکاں غیر از تو کس نیست　　　نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست

ڈاکٹر طاہر سعید کے نام (۳)

ڈاکٹر محمد مقصود

اسلام کا معاشی نظام

تفصیلات سے قطع نظر اسلام نے انسانیت کو جو معتدل اور منصفانہ معاشی نظام عطا کیا وہ اس اصولی ہدایت پر مبنی تھا کہ دولت اور سرمایہ جس کی حیثیت جسدِ معاشرہ میں بلاشبہ خون کی سی ہے کسی ایک فرد یا گروہ کے اندر سمٹنے کے بجائے مسلسل گردش میں رہے (الحشر: ۷)

اس مقصد کے لیے خالقِ نفسیاتِ انسانی نے نہ صرف یہ کہ معاشیاتِ اسلامی کے ہار میں تقسیمِ دولت اور گردشِ زر کے سُچے موتیوں کو خوبی کیساتھ پرو دیا۔ (البقرہ : ۲۷۱، ۲۸۰، ۲۶۷، ۲۶۸، النساء : ۳۰، ۳۶، التوبہ : ۳۴، ۶۰، آل عمران : ۱۸۰ الفاطر: ۲۹، الذاریات: ۱۹) بلکہ تخریب، خیانت اور مفاد پرستی کی ذہنیت پیدا کرنے والے خزف ریزوں کو بھی بڑی عمدگی سے نکال باہر کر دیا۔ (البقرۃ : ۱۸۸، ۲۸۳، آل عمران : ۱۶۱، المائدۃ: ۳۸، ۹۰، النساء : ۱۰، النور : ۲، ۱۹، ۳۳، المطففین : ۳)۔ اور یوں اکتنازِ مال کے شجرۂ خبیثہ کی جڑ کاٹ کر سُود جیسے حیوانِ شریر کو نہایت فراست کے ساتھ علی الاعلان ذبح کر دیا اور نہ صرف اس صنم کدے کے برہمنوں اور مجاوروں کے خرقۂ سالوس کو چیر کر انہیں ایک ایسے شخص سے تشبیہہ دی جسے شیطان نے چھو کر باولا کر دیا ہو (البقرہ : ۲۷۵) بلکہ اللہ کی کتاب نے ایسے ساہوکاروں کو یہ الٹی میٹم بھی دے دیا کہ اگر وہ شجرِ باطل کی اس آبیاری سے باز نہیں آتے تو خدا اور رسولؐ کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ (البقرۃ : ۲۷۹)

اس منصفانہ معاشی نظام پر طاغوت نے کیسے حملہ کیا ؟ :- اسلام کے اس منصفانہ معاشی نظام سے خدا در سولؐ کو خارج کرتے ہی طاغوت نے اس میں سود جیسی لعنت کو مرکزی مقام عطا کیا جیسا کہ بقولِ اقبال ؎